(غلام گردش)

## بھلے زمانے کے جج بالکل مختلف ہوتے تھے! (حصہ دوئم)

جج صاحب، ملتان سے سرگودھا آ گئے اور پھر لاہور۔ اس وقت تک میں کیڈٹ کالج سے ایف ایس سی کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج آ چکا تھا۔ 1978 کے لاہور کا ذکر کر رہا ہوں۔ جج صاحبان لاہور آنے سے کتراتے تھے۔ اسکی واحد وجہ سرکاری رہائشگاہ کا اَز حد مشکل سے ملنا تھا۔ بہر حال، جی او آر تھری شادمان میں دو سرکاری فلیٹ مل گئے اور والد وہاں منتقل ہو گئے۔ دو کمروں کے فلیٹ میں رہن سہن انتہائی سادہ سا تھا۔ لاہور میں، والد کے کئی دوست، کولیگ، سیشن جج سے ترقی کر کے ہائیکورٹ کے جج بن گئے تھے۔ جن میں شیخ وحید، اوصاف علی خان، راؤ اقبال کے نام یاد ہیں۔ جج صاحب ہی کے ایک کلاس فیلو، سردار محمد ڈوگر، براہِ راست ہائیکورٹ میں جسٹس تعینات ہو گئے۔ لاہور آنے سے پہلے، مجھے ضلعی عدلیہ کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ مگر اس شہر میں، ہائیکورٹ کے بہت سے جج صاحبان کو نجی طور پر جاننے کا موقعہ ملا۔ جن حضرات کا ذکر کیا ہے، ان سے بھی گاہے بگاہے ملاقات ہونے لگی۔ وہی روایتی سادگی کا عالم۔

جسٹس سردار ڈوگر کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ شام کو جب بھی انکے گھر گیا۔ گھر سے باہر فرش پر، موڑھے لگا کر بیٹھے ہوتے تھے۔ بالکل اکیلے۔ چار دیسی موڑھے اور انکے درمیان ایک چھوٹی سے میز۔ چائے کا ایک ہی مینیو تھا۔ سادہ چائے اور اسکے ساتھ تین چار کباب۔ گھر بھی مہمان داری حد درجہ کم تھی۔ جب بھی جاتا تھا، جسٹس ڈوگر مجھے پرانے لوگوں کے بھرپور قصے سنایا کرتے تھے۔ بتاتے تھے کہ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا، تو وہ ہندوستان سے ننگے پیر واٹن کے مہاجر کیمپ میں آئے تھے۔ مکمل طور پر بے آسرا۔ شروع میں انتہائی مشکل حالات دیکھے۔ ڈوگر صاحب میں حد درجہ سادگی دیکھی۔ کسی قسم کا کوئی لالچ سے مبرا انسان۔ تنہائی پسند اور میرٹ پر کام کرنے والا آدمی۔ بالکل یہی صورتحال، شیخ وحید صاحب کی تھی۔ وہ بھی ترقی کر کے لاہور ہائیکورٹ کے جج بن چکے تھے۔ بلکہ ڈوگر صاحب سے پہلے جج بنے تھے۔ جی او آر ون میں سرکاری گھر ملا تھا۔ جو سادگی ملتان میں تھی، لاہور میں بھی بالکل وہی تھی۔ گھر کے باہر دیوار نہیں تھی۔ سبزے کی ایک باڑ تھی۔ پوری کالونی میں کسی قسم کی کوئی خاص سیکیورٹی نہیں تھی۔ شیخ صاحب کے گھر کے باہر کوئی سپاہی تعینات نہیں تھا۔ یہ 1981 کی بات ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ ان حضرات کے سامنے، پولیس کی گاڑی بھی موجود نہیں ہوتی تھی۔ کوئی ہٹو بچو کی صدا سنائی نہیں دیتی تھی۔ آج اس طرح کے طرزِ عمل کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کی بابت عرض کرتا ہوں۔ ایک دن، والد صاحب کے ساتھ، لاہور آنا ہوا۔ انکی وکالت کے زمانہ کا دور تھا۔ خود گاڑی چلا رہے تھے۔ والد نے ماڈل ٹاؤن کے ایک گھر کے سامنے گاڑی روکی۔ اسکے باہر ایک سپاہی بندوق لیکر کھڑا ہوا تھا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق، گھر کے باہر کوئی دیوار نہیں تھی۔ ایک مختلف بات جو پہلی بار دیکھنے میں آئی۔ وہ گھر کے باہر ایک خیمہ تھا جس میں پولیس کے دو تین اہلکار بیٹھے ہوئے تھے۔ تجسس سے میں بھی والد صاحب کے ساتھ اندر چلا گیا۔ گھنٹی بجائی تو اندر سے ایک دیوہیکل آدمی باہر نکلا۔ چھ فٹ سے لمبا قد۔ سرخ و سفید رنگ۔ سفید بھنویں۔ مجھے ایسے لگا کہ امیر حمزہ کی کہانیوں والا جن ہے۔ ڈر کر، واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد، وہی شخص والد صاحب کو باہر چھوڑنے آیا۔ تو مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ والد سے

پوچھا کہ یہ بچہ مجھے دیکھ کر کیوں بھاگ گیا۔ والد صاحب نے جواب دیا، آپ خود پوچھ لیں۔ پوچھا تو میں نے کہا کہ کہیں آپ داستانِ امیر حمزہ کے جن تو نہیں ہیں۔ اس شخص نے قہقہہ لگا کر میرا گال تھپتھپایا اور کہا نہیں، میں دیو نہیں ہوں۔ وہ شخص لاہور ہائیکورٹ کا چیف جسٹس تھا۔ اپنے وقت کا سب سے طاقتور آدمی۔ یاد آتا ہے تو حیرانگی ہوتی ہے۔ گھنٹی پر خود دروازہ کھولنا، مہمان کو باہر خود گاڑی تک چھوڑنا، اسکے بیٹے سے گپیں لگانا۔ یہ طرزِ زندگی مکمل طور پر غیر مصنوعی تھا۔ دراصل، اس وقت کے لوگوں میں غرور یا تکبر بالکل نہیں تھا۔ شخصیت کی سادگی، رہن سہن میں بھی نظر آتی تھی۔ یہ پرانے وقت کی بات ہے۔ آج کی صورتحال سب کے سامنے ہے۔ عدلیہ کے چند اہم اراکین کو بھی پروٹوکول کا اتنا ہی شوق ہے۔ جتنا، سیاستدانوں کو اور بیوروکریٹس کو۔ شائد معاشرہ ہی تبدیل ہو چکا ہے۔

طرزِ زندگی کی سادگی کی مثال بھی دے سکتا ہوں۔ شیخ وحید صاحب، اس وقت لاء سیکرٹری تھے۔ انہیں پتہ کا آپریشن کروانا تھا۔ سروسز ہسپتال میں پروفیسر آف سرجری تھے۔ نام بھی وحید تھا۔ شیخ صاحب نے اپنا آپریشن سروسز ہسپتال میں کروایا۔ وہی آپریشن تھیٹر جو عام مریضوں کیلئے مختص تھا۔ اسی میں انکا آپریشن ہوا۔ بالکل اسی طرح، والد صاحب کو کوئی عارضہ لاحق ہوا۔ کسی کو بتائے بغیر، لاہور کے ایک سرکاری ہسپتال میں گئے۔ وہاں ایمرجنسی میں ڈاکٹر سے علاج کروایا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے انہیں ہسپتال میں داخل کرلیا۔ رات گئے پتہ چلا تو فوراً ہسپتال پہنچا۔ وہاں، جج صاحب، عام وارڈ میں موجود تھے۔ رات گزاری اور بڑے آرام سے صبح گھر آ گئے۔ کسی کو بتایا تک نہیں کہ وہی، اسی شہر میں سیشن جج ہیں۔ کوئی مبالغہ آرائی نہیں کر رہا۔ کوئی فسانہ نہیں سنا رہا۔ سادہ زندگی کی یہ روش ماضی کی عدلیہ میں کثیر طور پر موجود تھی۔ سماجی تقاریب میں بھی یہی عالم تھا۔ جس وقت میری چھوٹی ہمشیرہ، کی شادی ہوئی تو جج صاحب سیشن جج جہلم تھے۔ پوری زندگی میں اپنے والد کو پریشان نہیں دیکھا۔ مگر چھوٹی بہن کی شادی پر وہ اَز حد متفکر تھے۔ اس وقت لاہور جم خانہ میں شادی کی تقاریب کی اجازت تھی۔ شادی وہیں ہوئی تھی۔ انتظام بھی سادہ سے تھے۔ اب تو ایک سے زیادہ کھانوں پر پابندی ہے۔ مگر اس وقت بھی اس تقریب کا کھانا سادہ سا ہی تھا۔ دو یا شائد تین کھانے۔ بہرحال کوئی حد درجہ بہتات کا عالم ہرگز ہرگز نہیں تھا۔ بیٹیوں کی شادی پر باپ کا پریشان ہونا لازم ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت کی عدلیہ، جسکو دیکھنے کا نایاب موقعہ ملا، حد درجہ سادہ اور سنکسر المزاج تھی۔ ہرگز یہ عرض نہیں کر رہا کہ اس وقت یعنی ماضی میں سب کچھ ٹھیک تھا۔ مگر اُصول اور انصاف کرنے والے جج صاحبان کی تعداد زیادہ تھی۔ ذاتی مفادات کو بالاتر رکھنے کا ہرگز ہرگز رواج نہیں تھا۔ بطور ادارہ، عدلیہ بہترین کام کر رہی تھی۔ سفارش کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک دن والد صاحب کے کزن نے کسی عام سے کیس میں انہیں سفارش کی۔ جج صاحب نے انتہائی متانت سے چائے پلائی۔ اسکے بعد کہا کہ آئندہ تم نے میرے گھر آنے کی جرات نہیں کرنی۔ کبھی میرے پاس نہیں آنا۔ چلے جاؤ۔ اس سے پہلے میں غصہ میں کچھ اور کہہ دوں۔ رشتے کے میرے چچا نے خاموشی سے راستہ ناپا۔ اسکے بعد سالہا سال، میرے والدان سے ناراض رہے اور گھر آنے پر پابندی رہی۔ یہ سب کچھ عرض کرنے کا ایک مقصد ہے۔ قطعاً شوق نہیں کہ چالیس پچاس برس پہلے کی عدلیہ کی تعریف کروں۔ صرف بتانا چاہتا ہوں کہ ہر ادارے کی طرح، عدلیہ بھی گزشتہ تیس پینتیس برس میں بگاڑ کی طرف گئی ہے۔ اسکا اعتراف کرنا بہت مشکل ہے۔ تسلیم کرنا بھی دشوار ہے۔ یہ بگاڑ اعلیٰ عدلیہ میں زیادہ آیا ہے۔ کالم میں ساری وجوہات بیان کرنا ناممکن ہے۔

پنجاب میں اَل شریف کے اقتدار شروع ہوتے ہی جہاں انہوں نے اے سی، ڈی سی، ایس پی اور تھانیدار تک اپنے لگانے شروع کر دیے۔ بالکل اسی طرح، ہائیکورٹ میں بھی اپنے واقف، تعلقدار، دوست اور قرابت داروں کو بطور جج بنوانا شروع کر دیا۔ 1985 سے آگے کے حالات یکسر تبدیل ہو گئے یا کر دیے گئے۔ جہاں، اپنا خاص الخاص بندہ، چیف سیکرٹری کے طور پر لگوایا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح بھرپور کوشش کی جاتی تھی کہ ''اپنے بندوں'' کو جج لگوایا جائے۔ اس زمانے میں صوبے کے وزیر اعلیٰ کا ججوں کی تعیناتی میں بہت عمل دخل تھا۔ تلخ بات عرض کر رہا ہوں۔ اَل شریف شروع سے اس فلسفہ پر عمل کرتی تھی کہ ہر جگہ، ہر ادارے میں انکی مرضی کے لوگ ہی ہوں۔ انکے خلاف فیصلہ یا کام کرنا تو دور کی بات، انکے مفادات کے خلاف سوچنے والا بھی راندہ درگاہ ٹھہرایا گیا۔ معاملہ صرف قابل وکلاء تک رہتا، تو بھی کافی حد تک قابل تسلیم تھا۔ مگر اَل شریف نے اپنے سیاسی کارکنوں تک کو ہائی کورٹ کا جج بنوا دیا۔ جو چیف جسٹس تک کے عہدے پر فائز رہے اور پھر سپریم کورٹ میں بھی انکے مفادات کی نگہبانی کرتے رہے۔ اتفاق فاؤنڈری کے تقریباً ہر لیگل ایڈوائزر کو جج بنایا گیا۔ یعنی، عدلیہ میں ذاتی تعلق کی بنیاد پر قیامت برپا کر دی گئی۔ اعلیٰ عدلیہ کے متعلق مودبانہ گزارش کر رہا ہوں، کہ بھرپور ترکیب کے ساتھ، اسکو ایک خاندان کے تابع کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کی، جو بہر حال کامیاب رہی۔ اس پالیسی کے تحت، اَل شریف کو عدلیہ سے وہ وہ سہولتیں ملیں، جو عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اربوں روپے کے قرضوں کو عدالتی نظام کے تحت دہائیوں تک کیلئے منجمد کروا دیا گیا۔ یہ خطرناک کھیل کم از کم تیس پینتیس سال چلتا رہا۔ اسکے عملی نتائج سب نے بھگتے اور ادارہ کی ساکھ میں بھی فرق آیا۔

بعینہ یہی کھیل، احتساب عدالت میں بھی کھیلا گیا۔ وہی روایتی ہتھکنڈے، وہی دھمکیاں، وہی پیسے کا لین دین۔ اس ترکیب کو یہاں بھی استعمال کیا گیا۔ اسکے نتائج کیا نکلتے ہیں، اس پر کافی کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مگر اس وقت کیونکہ معاملہ سپریم کورٹ میں ہے، اسلیے کچھ بھی عرض کرنا مناسب نہیں۔ موجودہ کھیل کے ایک کردار جج ارشد ملک پر ضرور گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ارشد ملک کون ہے۔ کتنے مرلے کا مکان میں رہتا ہے۔ جج کیسے بنا۔ احتساب عدالت میں کس کے ذریعے لگوایا گیا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر جب ارشد ملک کے نام کے ساتھ جج کا لفظ لگ جاتا ہے۔ تو فوری طور پر میرے جیسے طالبعلم کی اس عہدے کے لحاظ سے توقعات شروع ہو جاتی ہیں۔ مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں، کہ جج ارشد ملک کس کس سے ملتا رہا۔ مگر میرا سوال صرف یہ ہے کہ کیا ایک منصف کا کسی بھی صورتحال میں مجرم یا ملزم سے براہِ راست رابطہ مناسب ہے؟ کیا جج کا تعیناتی کے ضلع میں منشیات فروشوں کے گروہ سے شناسائی درست ہے؟ کیا کسی بھی مہذب معاشرے میں جج کا رنگین سماجی دعوتوں میں جانا ایک قابل قبول رویہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ قطعاً نہیں۔ میرا کسی بھی فریق سے کوئی لینا دینا نہیں۔ لیکن عدلیہ کے دیرینہ شناسا کے طور پر مجھے ارشد ملک کے رویے سے اَز حد رنج ہوا ہے۔ غیر جانبدار جج صاحبان کا رویہ بھی شائد ایسا ہی ہو! صرف احتیاط سے یہ عرض کرونگا کہ بھلے وقتوں کے جج صاحبان، بہت مختلف ہوا کرتے تھے!

راؤ منظر حیات